اکائی 5 ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 ولی دکنی کی غزل گوئی کی خصوصیات

5.3.1 متن کی تدریس

5.3.2 سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

5.3.3 متن کی تدریس

5.4 آپ نے کیا سیکھا

5.5 اپنا امتحان خود لیجئے

5.6 سوالات کے جوابات

5.7 فرہنگ

5.8 کتب برائے مطالعہ

5.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے۔
- ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔
- ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت متعین کریں گے۔
- ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے ہم عصر شعرا کے متعلق جانکاری حاصل کریں گے۔

5.2 تمہید

علوم جغرافیہ کے ماہرین ہندستان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔شمالی ہنداور جنوبی ہند۔ اردو پیدا تو ہوئی شمالی ہند کے علاقے، دہلی اور نواح دہلی میں مگر اس کے ادب کا آغاز وارتقا جنوبی ہند میں ہوا جو نہ صرف دہلی سے ہزاروں میل دور تھا بلکہ جہاں کی زبان، تہذیب اور معاشرت بھی مختلف تھی۔ بہرحال جن سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی تقاضوں کے تحت اردو شمالی ہند سے جنوبی ہند پہنچی اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

شمالی ہند کے حکمراں علاءالدین خلجی نے 1310ء تک سارے دکن کو فتح کر کے اپنی حکومت قائم کر دی اور بہتر انتظام و انصرام قائم رکھنے کے لیے سارے دکن کو سو۔سو مواضعات میں تقسیم کر کے انتظامی حلقے بنا دیئے اور ہر حلقے پر شمالی ہند

سے تعلق رکھنے والا اپنا ایک افسر مقرر کیا جو ''امیر صدہ'' کہلاتا تھا اس طرح شمالی ہند کے بے شمار خاندان دکن میں آباد ہو گئے اور وہ شمالی ہند کی زبان بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

1327ء میں محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت بنایا اور دہلی کی ساری آبادی کو دولت آباد ہجرت کر جانے کا حکم صادر کر دیا۔ اتنی بڑی آبادی کے دکن پہنچنے پر اصحاب صدہ کے ذریعے اردو کے فروغ کے لئے جو زمین تیار ہوئی تھی اس میں اور برگ و بار آنے لگے۔

مزید یہ کہ اب دکن کی طرف صوفیا کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی، جو عوام میں دین کی تبلیغ کے لیے اس وقت کی بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔ یہی کچھ سیاسی و تہذیبی وجوہات تھیں جن کے ذریعے بول چال کی زبان، جو بعد میں اردو کہلائی، جنوبی ہند پہنچی۔ اور شمال و جنوب کے لوگوں کے درمیان رابطے کے لیے زیادہ موزوں اور مناسب ثابت ہوئی کیوں کہ اس کے اندر دکنی زبانوں کو جذب کرنے کا مادہ بھی تھا۔ رفتہ رفتہ اس زبان اور اس کے ادب نے اتنا عروج حاصل کر لیا کہ اس میں ولؔی اور سراؔج جیسے شاعر پیدا ہوئے۔

5.3 ولؔی کی غزل گوئی کی خصوصیات

ولؔی ولی ہے سخن میں جہاں کے بیچ، اس کا دیوان دکن سے شمال کیا آیا کہ اردو غزل کی رگوں میں نیا خون دوڑ گیا، اسے نئی زندگی مل گئی، اس میں نیا نکھار اور نئی خوشبو پیدا ہو گئی۔ حاتؔم نے ''دیوان زادہ'' کے مقدمے میں لکھا:

''فارسی میں میرزا صاحب کی پیروی کرتا ہوں اور ریختہ میں ولؔی کو اپنا استاد مانتا ہوں۔''

اسی مضمون کو انھوں نے اپنے اس شعر میں بھی بیان کیا ہے ؎

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولؔی ولی ہے سخن میں جہاں کے بیچ

محمد حسین آزاؔد نے ایک جگہ لکھا:

''جب ان کا دیوان دہلی پہنچا تو اشتیاق ادب نے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت سے زبان نے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت میں انھیں کے گیت گانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انھیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔ اس طرح اردو شاعری بالخصوص ترقی کے امکانات بہت روشن ہو گئے تھے۔'' آبؔرو کہتے ہیں ؎

آبؔرو شعر ہے ترا اعجاز
پر ولؔی کا سخن قیامت ہے

میؔر کا فرمانا بھی مستند ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

لیکن تمام تر جدید وسائل تحقیق کے ہاتھ آجانے کے باوجود ابھی تک نہ تو ولی کی تاریخ پیدائش کا صحیح تعین ہو سکا ہے نہ ان کے وطن کا اور نہ ہی ان کی تاریخ وفات اور مقام مدفن کا۔ محققین و ناقدین نے انھیں نہ اورنگ آباد کا رکھا نہ گجرات کا اور نہ دکن کا اور ولی پر کام کرنے والی آئندہ نسلوں کے لیے ایک بھول بھلیاں بنا دیا۔ یہاں تک کہ ولی کے نام پر بھی محققین و ناقدین متفق نہیں، کوئی ولی اللہ لکھتا ہے تو کوئی محمد ولی کو صحیح ٹھہراتا ہے، کوئی ولی محمد کو درست کہتا ہے تو کوئی کہتا ہے کہ سید ولی محمد ہی اصل ہے۔ غنیمت ہے کہ ولی سب میں مشترک ہے چنانچہ یہی مقبول خلائق ہو کر درست ٹھہرا۔

ولی کے وطن کے بارے میں بھی کچھ لوگوں کے فرمودات دیکھیں۔ قائم چاند پوری ''مخزن نکات'' میں انھیں گجراتی لکھتے ہیں۔ میر حسن بھی ''تذکرۂ شعرا'' میں انھیں گجراتی بتاتے ہیں۔ فتح علی گردیزی ''تذکرہ ریختہ گویاں'' میں ولی کو دکنی لکھتے ہیں۔ قدرت اللہ قاسم ''مجموعۂ نغز'' میں انھیں دکنی بتاتے ہیں۔ لچھمی نرائن شفیق ''چمنستان شعرا'' میں ولی کو اورنگ آبادی کہتے ہیں۔ میر بھی ''نکات الشعرا'' میں انھیں اورنگ آبادی لکھتے ہیں۔ ولی خود اپنے کو دکنی لکھتے ہیں ؎

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

قدیم تو قدیم جدید محققین بھی اختلاف رائے کا شکار ہیں۔ ظہیر الدین مدنی گجراتی ثابت کرنے پر مصر ہیں تو اورنگ آباد کے ایک صاحب آغا مرزا بیگ اپنی تصنیف ''ولی اورنگ آبادی'' میں انھیں اورنگ آبادی ثابت کرتے نہیں تھکتے۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی کی رائے کچھ متوازن نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''ولی کے باپ دادا گجرات سے ہجرت کر گئے تھے... ولی گجرات سے تعلق رکھنے کے باوجود دکن میں آ کر دکنی ہو گئے۔'' مختصر یہ کہ ولی کا تعلق کہیں سے ہو، وہ اردو کے شاعر ہیں اور انھوں نے اردو کا وقار بلند کیا ہے۔

ولی کے وطن کی طرح ان کے سنہ وفات کے تعین میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ ظہیر الدین مدنی نے اپنی تصنیف ''ولی گجراتی'' میں ایک طویل بحث کے بعد ولی کا سنہ وفات چار شعبان 1119ھ (1707ء) طے کیا ہے، لیکن جمیل جالبی اس سے متفق نہیں ہیں وہ مختلف قرائن سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ولی کی وفات 1720ء سے 1725ء کے درمیان ہوئی۔

بہر حال ولی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں یہ غزل کا دور تھا گو کہ دکنی شعرا دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کر رہے تھے مگر غزل سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ ولی نے بھی دوسری اصناف میں داد سخن دیا ہے مگر بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ غزل میں ان کا خاص موضوع عشق اور متعلقات عشق ہے۔

ولی کی شاعری میں گرم جوشی کا سبب ان کی رگ و پے میں عشق کا اتر جانا ہے۔ انھوں نے شاعری کی منزلیں طے کرنے کے لیے عشق کو اپنا رہنما بنا لیا۔ ولی کے یہاں عشق برائے شعر گفتن نہیں بلکہ ایسا جذبہ صادق ہے جس کی ہر کیفیت سے وہ پوری طرح آگاہ ہیں۔ راہ عشق کی سختیوں اور پریشانیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔

گریہ و گرد علامت سوں ولی خانہ عشق کو تعمیر کیا

ولی نے عشق کی کیفیات کو اس دل فریبی کے ساتھ پیش کیا کہ اس میں نیا نکھار اور نئی تابانی آ گئی۔ انھوں نے اس میں

فارسی اور دکنی کے امتزاج سے ایسا آہنگ پیدا کیا ہے جو جمالیاتی انبساط سے لبریز ہے۔

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل رو سوں
خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سوں
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اے ولی طرز عشق آساں نہیں آزمایا ہوں میں کہ مشکل ہے

ولی سے پہلے دکنی روایت میں غزل کا تصور اس کے لغوی معنی، یعنی عورتوں سے باتیں کرنا یا ان کے بارے میں باتیں کرنا، تک محدود تھا اس میں کسی گہرے تجربے یا حقیقی جذبات و احساسات کا پتہ نہیں چلتا۔ ولی نے اس روایت کو اپنایا تو مگر اس میں زندگی کے رنگا رنگ تجربات، داخلی جذبات و احساسات اور واردات قلبیہ داخل کر کے اسے ایسی صنف بنا دیا جس میں زندگی کے ہر رنگ اور ہر تجربات کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی اور زندگی کے چھوٹے بڑے تمام تجربات اس کے دامن میں سمٹ آئے۔ جتنے مضامین اردو غزل سے وابستہ ہیں وہ سب ولی کے یہاں ملتے ہیں۔

غزل میں محبوب کا سراپا بیان کرنا ایک عام موضوع تھا، ولی نے بھی اسے برتا لیکن ان کے مزاج کی سنجیدگی، شائستگی اور لطافت شیوۂ عشق کو قائم رکھتے ہوئے حسن کو رسوا نہیں ہونے دیتی۔

ولی کے عشق میں لذت کوشی ہے اور نہ بوالہوسی ان کے تصور عشق میں پاکیزگی کا احساس ہے۔ ان کے یہاں وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ ولی نے عشق مجازی کے تمام پہلوؤں کو برتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

در وادیٔ حقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

اور جب وہ وادیٔ عشق میں ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے تو تصوف کی روایت کے تمام موضوعات اپنی غزلوں میں سمیٹ لیتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے مخصوص و منفرد لہجے سے اس میں ایسا رنگ بھر دیتا ہے جو قاری کے دلوں کو چھو لیتا ہے کیوں کہ یہاں شائستگی و لطافت کے ساتھ نرم روی، بے نیازی اور درویشانہ قناعت کا احساس ہوتا ہے۔

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے
سنبھال کشتیٔ دل کو قلندری یہ ہے

نکال خاطر فاطر سوں جام جم کا خیال
صفا کر آئینہ دل کا سکندری یہ ہے

عشق نے ولی کے دل کو گداز کر دیا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا سوز و گداز پر اثر ہے۔ ولی کے یہاں واردات قلبی اور حسن و جمال کی صفات کا اظہار اتنے سادہ اور سلیس انداز میں ہوا ہے کہ براہ راست دل تک پہنچتا ہے۔ ولی مجاز

کے پردے میں حقیقت کے راز ہائے سربستہ کی عقدہ کشائی بھی کرتے ہیں اور ان کے یہاں مجاز و حقیقت کہیں کہیں الگ الگ بھی ہیں لیکن اکثر یہ ایک دوسرے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کا محبوب بھی مجازی اور حقیقی دونوں روپ میں نظر آتا ہے۔ ولی کا محبوب اردو شاعری کا وہ روایتی محبوب نہیں ہے جو کسی اور دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا ہے بلکہ ان کے محبوب کا تعلق اسی عالم رنگ و بو سے ہے جو اپنے زمانے کی تہذیبی روایات کا حامل ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ وہ کہیں کہیں فارسی روایات کے برعکس اپنے محبوب کے لیے مؤنث کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

ولی کے کلام کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی روایات کے ساتھ ہندی روایات کو بھی بخوبی برتا ہے اور دونوں کو ایسا شیر و شکر کیا ہے کہ ایک نیا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ ولی کے کلام میں کرشن اور گوپیاں بھی ہیں، ارجن بھی ہیں جوگی، بیراگی اور سنیاسی بھی، دیوالی کے دیئے بھی روشن نظر آتے ہیں تو بانسری کے سر بھی سنائی دیتے ہیں اور طبلے کی چھاپ بھی گونجتی ہے، وہیں گنگ و جمن، تاپتی و نربدا کے دھارے بھی بہتے نظر آتے ہیں۔

مثال کے لیے چند اشعار پیش ہیں:

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم
ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

گنگا رواں کیاں ہوں اپس کے نین ستی
آ اے صنم شتاب ہے روزے نہان آج

تری زلفاں کے حلقے میں دِسے یوں نقش رخ روشن
کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں

اسی طرح ولی نے ہندی الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت استعمال کرنے کی بھی مثال قائم کی ہے جیسے روزِ نہاں، رنگ پان، نین ساقی وغیرہ۔

ولی کے کلام میں استعمال ہونے والی زبان پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں دکنی، گجری، ہندوی اور دوسری علاقائی بولیوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ بعض ناقدین فن نے ان کے اشعار کو زبان کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ ہیں جن میں خالص دکنی، گجری اور ہندوی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی لیکن ان کی زبان بھی قدیم دکنی شعرا کے مقابلے کافی صاف اور سادہ ہے۔ دوسرے وہ اشعار جن میں لفظوں کی تبدیلی سے اس وقت کی زبان بن سکتی ہے۔ تیسرے وہ اشعار ہیں جن کی زبان اور تراکیب بالکل میر و سودا کے دور کی ہے۔ ولی نے اپنے عہد سے پہلے کی زبان اور جدید زبان کے اثرات اپنی شاعری میں اس طرح جذب کیے ہیں کہ وہ نہ صرف شمال و جنوب دونوں جگہوں کے عوام کے لیے باعث انبساط ہو

گئی بلکہ آنے والی نسلوں کی لطف اندوزی کا سامان بھی فراہم کر دیا۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''دلچسپ بات یہ ہے کہ ولؔی کے یہاں زبان کا ارتقا ایک طرف دکنی سے ریختہ کی طرف ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ ریختہ سے اردوئے معلیٰ کی طرف بھی۔ یہ دونسلوں کا کام ولؔی نے خود انجام دیا۔''

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013، ص:413)

ولؔی کسی جذبے، کسی احساس، کسی خیال یا کسی کیفیت کے اظہار کے لیے نہ تو فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہیں اور نہ معنوی تہہ داری سے کام لیتے ہیں۔ وہ ہر بات اتنے سیدھے سادھے اور دلکش انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری کا دل موہ لیتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کا نام شاعری ہے۔ اس کی اعلیٰ مثال ولؔی کی شاعری ہے۔ وہ موضوع سے مناسبت رکھنے والے الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ اس کی سلاست اور روانی کسی نرم سیر دریا کی طرح رواں رہتی ہے جس سے ہلکی ہلکی سکون بخش موسیقی پھوٹتی رہتی ہے۔

مرے دل کوں کیا بے خود تری انکھیاں نے آخر کوں
کہ جوں بیہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولؔی دایم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

ولی، دکنی، ہندوی اور فارسی محاوروں اور ضرب الامثال کو اس صفائی اور برجستگی سے کھپاتے ہیں کہ لطف اندوزی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ولؔی نے ایہام کو بہت کم برتا ہے لیکن جہاں برتا ہے نہایت چابکدستی کے ساتھ۔

گرچہ لچھمن ترا ہے رام ولے
اے سجن تو کسی کا رام نہیں

اے صنم تجھ جبیں اُپر یہ خال ہندوئے ہر دوار باسی ہے

کہا جاتا ہے کہ عظیم فن پارہ وہ ہے جس پر وقت کا اثر نہیں ہوتا اس کی تابندگی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ولؔی کی شاعری کا بھی وہی عالم ہے کہ جو تھا۔ وہ زندہ ہے روشن ہے، اس کی تابندگی نہ کم ہوئی ہے نہ کم ہوگی۔

5.3.1 متن کی تدریس

I غزل

جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ جسے یار جانی سوں یاری لگے
نہ ہوے اسے جگ میں ہرگز قرار جسے عشق کی بے قراری لگے

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں پیارے! تری بات پیاری لگے
ولی کوں کہے تو اگر اک بچن رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

اشعار کی تشریح:

غزل کے متن کی براہِ راست تدریس شروع کرنے سے پہلے استاد کو چاہیے کہ وہ پہلے غزل کے بارے میں بتائے کہ غزل کہتے کسے ہیں؟ اس کی صنفی شناخت کیا ہے؟ یعنی ہم یہ کس طرح پہچانیں کہ یہ غزل ہے مثنوی نہیں ہے۔ کچھ اصناف اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہیں اور کچھ موضوع سے۔ غزل اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہے اس لیے طلبہ کو اس کی ہیئت کے بارے میں بتائیں، پھر غزل کے فن پر روشنی ڈالیں کہ غزل کے فنی امتیازات کیا ہیں۔ غزل کے آغاز وارتقا سے بھی طلبا کو روشناس کرانا چاہیے۔

مذکورہ متن ولی کی تخلیق ہے اس لیے ولی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیات سے بھی طلبا کو واقف کرایا جائے۔ اب بات آتی ہے متن کی تو اس پر اس طرح روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

اس غزل کا بنیادی موضوع عشق ہے۔ پوری غزل میں شاعر نے عشق کی ماہیت اس سے پیدا ہونے والی کیفیات و صورت حال کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ شعر بہت سیدھے سادے انداز اور آسان ترین الفاظ میں کہا گیا ہے جو سہل ممتنع کے مرتبے کو پہنچ جاتا ہے۔ سہل ممتنع اس شاعری کو کہتے ہیں جو آسان اور سادہ زبان میں ہو اور جس کی نثر نہ کی جاسکے۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ اگر کسی کو واقعی عشق ہو جائے تو اسے زندگی گزارنی مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ عشق میں وہ کلفتیں اور اذیتیں جھیلنی پڑتی ہیں کہ اسے زندگی بھاری لگنے لگتی ہے۔ یا تو شاعر عشق کے ان مراحل سے گذرا ہے یا مشاہدے سے یہ تجربہ حاصل کیا ہے اور جس کو بڑے اچھے اسلوب میں بیان کر دیا۔

نہ چھوڑے محبت دم مرگ لک جسے یار جانی سوں یاری لگے

اس شعر میں شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ یار جانی یعنی جان کی طرح عزیز محبوب سے اگر یاری یعنی محبت ہو جائے تو وہ پھر زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے۔ اس میں شاعر محبوب کی تعریف وتوصیف بیان کر رہا ہے کہ محبوب اتنا دل فریب اور خوش ادا ہے کہ ایک بار اس سے محبت ہو جائے تو پھر اس سے روگردانی ممکن نہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عشق ایسا روگ ہے کہ ایک بار لگ گیا تو پھر موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار جسے عشق کی بے قراری لگے

شاعر اس شعر میں سیدھے سیدھے عشق کی ایک کیفیت بیان کر رہا ہے کہ اگر کسی کو عشق ہو جائے تو یہ ایسی بے چین کر دینے والی چیز ہے کہ اسے دنیا میں کہیں قرار اور سکون نہیں ملے گا۔

ولی کوں کہے تو اگر اک بچن رقیباں کے دل میں کٹاری لگے

اس شعر میں شاعر محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تو مجھ سے تھوڑی سی بھی بات کرے تو رقیبوں کے دل پر کٹاری کی طرح لگتی ہے یعنی رقابت کی وجہ سے وہ جل بھن جاتے ہیں۔

II غزل

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی وکیا مجازی کا
ہر زباں پر مثل شانہ مدام — ذکر تجھ زلف کی درازی کا
ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا
نین دکھا کے اَپس کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا
آج تیری بھواں نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
گر نہیں راز عشق سوں آگاہ — فخر بیجا ہے فخر رازی کا
اے ولیؔ! سرو قد کوں دیکھوں گا — وقت آیا ہے سرفرازی کا

اشعار کی تشریح:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا — کیا حقیقی وکیا مجازی کا

شاعر نے اس شعر میں عشق کی توصیف بیان کی ہے کہ خواہ عشق حقیقی ہو یا مجازی ہو وہ لایق ستائش ہے کیوں کہ عشق حقیقی قرب الٰہی کا وسیلہ ہے اور عشق مجازی اس کا پہلا زینہ۔ یہاں شاعر نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔

ہر زباں پر مثل شانہ مدام — ذکر تجھ زلف کی درازی کا

اس شعر میں شاعر کا موضوع محبوب کی زلف کی تعریف ہے۔ اس زلف کی صفت یہ ہے کہ بہت لمبی ہے جس سے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گیا ہے۔ شاعر اس سیدھی سی بات کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر زبان پر تیری زلف کی درازی کا چرچا ہر وقت رہتا ہے۔ وہ لوگوں کی زبانوں کو شانہ یعنی کنگھی سے تشبیہ دیتا ہے کہ اس میں بھی بہت سی شاخیں ہوتی ہیں اور شانہ کا لفظ زلف کی مناسبت سے لایا گیا ہے جسے رعایت لفظی کہتے ہیں۔ لوگوں کی زبان پر ہمیشہ تیری زلف کی درازی کا ذکر رہتا ہے اور کنگھی بھی تیری زلف کے قریب رہتی ہے۔ دونوں میں مماثلت ہے۔

ہوش کے ہاتھ میں عناں نہ رہی — جب سوں دیکھا سوار تازی کا

یہاں شاعر اپنے محبوب کو تازی گھوڑے پر سواری کرنے والا شاندار سوار بتا رہا ہے (تازی گھوڑے کی ایک اچھی نسل) لہٰذا وہ کہتا ہے کہ جب سے میں نے اس شاندار سوار کو دیکھا ہے میرے ہاتھ سے ہوش وحواس کی لگام چھوٹ گئی یعنی میرے ہوش و حواس جاتے رہے۔ یہاں بھی رعایت لفظی ہے۔ تازی یعنی گھوڑے کی رعایت سے عناں یعنی لگام لائے ہیں۔

نین دکھا کے اَپس کے مکھ کی کتاب — علم کھویا ہے دل سوں قاضی کا

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تو نے اپنے رخ کی کتاب حسن کو کیا دکھایا کہ میں سارے علم بھول گیا۔ یہاں بھی محبوب

کے حسن کی تعریف کی جارہی ہے۔ کتابی چہرہ ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہوتا ہے بہت خوبصورت چہرہ، کتابی کی مناسبت سے علم لائے ہیں۔ یہ بھی معشوق کی تعریف کا ایک نرالا طور ہے۔

آج تیری بھواں نے مسجد میں ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

مسجد میں محراب ہوتی ہے۔ مسجد کی محرابوں نے تیرے بھوؤں کی ایسی یاد دلائی کہ تمام نمازیوں نے ہوش کھو دیئے۔ یہاں محبوب کی بھوؤں کے متناسب محرابی زاویے کی تعریف مقصود ہے جو مسجد کی خوبصورت محراب کے مانند ہے۔

گر نہیں راز عشق سوں آگاہ فخر بیجا ہے فخر رازی کا

یہاں بھی عشق کو بہت وسیع و بلیغ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر تو عشق کی اصلیت، ماہیت اور کیفیت سے آگاہ نہیں تو ابو بکر محمد ابن ذکریا رازی کے برابر بھی ہو جائے، جس پر دنیا فخر کرتی ہے، تو بھی تجھ پر فخر نہیں کیا جا سکتا۔

اے ولی، سرو قد کوں دیکھوں گا وقت آیا ہے سرفرازی کا

یہاں شاعر اپنے محبوب کے قد کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آج میں سرو کی طرح بلند قامت محبوب کو دیکھوں گا۔ چونکہ وہ بلند و بالا ہے اس لیے سر اٹھا کے ہی دیکھوں گا اس کے ایک معنی یہ بھی ہے کہ محبوب کا دیدار کرنا اس کے لیے سعادت اور سرفرازی ہے۔ سرفرازی کا مطلب ہے فخر سے سر اونچا کرنا۔

5.3.2 سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی کی خصوصیات

دکنی شاعروں میں ولی کے بعد سراج کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہے اور دکن ہی کیا شمال میں بھی ایک عرصہ گزر جانے اور زمین سخن کے آسمان ہو جانے (مری قدر کر اے زمین سخن ☆ تجھے بات میں آسماں کر دیا) کے باوجود سراج کا نام بہت ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے اور یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ولی کے بعد اور عہد میر و سودا سے قبل کے سب سے بڑے شاعر سراج ہیں۔ اس عہد کے تذکرہ نگاروں نے سراج کی شاعری پر تو کافی لکھا ہے مگر ان کی شخصیت اور خاندانی حالات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔ لچھمی نرائن شفیق سراج کے معتقد بھی تھے اور ان سے دو بار ملاقات بھی کر چکے تھے مگر اپنے تذکرے ''چمنستان شعرا'' میں ان کے سوانحی حالات زیادہ تحریر نہ کر سکے۔ 1940ء میں عبدالقادر سروری نے کلیات سراج مرتب کیا مگر وہ بھی سراج کے حالات، دستیاب نہ کر سکے۔

سراج کا دیوان ان کے برادر طریق عبدالرسول خاں نے 1739ء میں مرتب کیا اور اس کا نام ''انوار السراج'' رکھا۔ سراج کے قریبی دوست ضیاء الدین پروانہ نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے سے سراج کے بہت سے سوانحی گوشے روشن ہوئے ہیں۔ ''انوار السراج'' کا مخطوطہ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے کہیں سے حاصل کر لیا اور اب وہی سراج کے حالات زندگی کے انکشافات کا معتبر ذریعہ ہے۔

سراجؔ کا اسم گرامی سید سراج الدین تھا۔ سراجؔ کے جدامجد مدینہ سے ہجرت کر کے ہندستان آئے اور نواح دہلی میں آباد ہو گئے۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ سید درویش نے اورنگ زیب کے عہد میں ہجرت کر کے اورنگ آباد کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ ان کا خاندان صوفیانہ طرز زندگی کی طرف مائل تھا چنانچہ سید درویش بھی درس و تدریس اور ذکر و اذکار میں اپنا وقت گزارتے تھے۔

اورنگ آباد کے نواح میں رہنے والے صوفی سید عبداللطیف کی صاحبزادی سے سید درویش کا عقد ہوا اور 13 رصفر 1124ھ (21 رمارچ 1712ء) کو ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام سید سراج الدین رکھا گیا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے سراجؔ کی تاریخ پیدائش 1716ء متعین کی تھی جو نثار احمد فاروقی والے مخطوطے کے حاصل ہو جانے کے بعد غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ سید درویش کی کسی اور اولاد کا تذکرہ کہیں نہیں ملتا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج سید درویش کی اکیلی اولاد تھے۔

بہرحال سید درویش چونکہ درس و تدریس سے ہی ملحق تھے۔ لہٰذا سراج کی تربیت اور علوم متداولہ کی تدریس انھوں نے خود ہی کی۔ لیکن سراج بارہ تیرہ سال کے ہوئے تو ان پر دیوانگی طاری ہونے لگی
کہتے ہیں کہ یہ دیوانگی عشق کا نتیجہ تھی۔ کبھی کبھی کیفیت دیوانگی اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ گھر سے نکل کر جنگل و بیابان میں پھرا کرتے اور حضرت برہان الدین کی درگاہ میں پڑے رہتے یہاں تک کہ انھیں اپنی بے لباسی کا بھی خیال نہیں رہتا۔ کبھی کبھی تو ان کے والد کو انھیں پابہ زنجیر کرنا پڑتا۔ سراجؔ کا یہ عارضہ دیوانگی متواتر سات سال تک چلتا رہا۔ حالت دیوانگی میں ان کی زبان سے بے ساختہ فارسی اشعار نکلتے تھے۔ ''انوارالسراج'' کے دیباچے میں سراجؔ نے خود لکھا ہے کہ جب بھی ان پر دیوانگی کا عالم طاری ہوتا تو ان کی زبان سے فارسی اشعار نکل پڑتے۔ مگر افسوس کہ انھیں محفوظ نہیں کیا جا سکا۔

(پروفیسر نثار احمد فاروقی، سراج اورنگ آبادی پرنئی روشنی، امکان، سراج نمبر، ص:16)

اتنی کم عمری میں اتنا علم حاصل کر لینا ہے تو تعجب خیز لیکن تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں فارسی شعرا کے دیوان کے دیوان ازبر تھے۔ اس سے ان کے قوت حافظہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور فارسی اشعار کا بے محابہ نکل پڑنا بھی ممکن معلوم ہوتا ہے۔

عارضۂ دیوانگی سے افاقے کے بعد تقریباً 1731ء میں ایک صوفی سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی کے ہاتھ پر بیعت کر کے سراجؔ باقاعدہ صوفی ہو گئے اور پھر ساری زندگی اسی طرح گزار دی۔ 1739ء میں سراج کے برادر طریق عبدالرسول خاں نے دیوان سراج مرتب کیا۔ جمیل جالبی ''منتخب دیوانہا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''اور جب اسے (دیوان سراج کو) پیرومرشد کی خدمت میں پیش کیا گیا تو حکم ہوا کہ شعر گوئی ترک کر دی جائے۔''

(جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013)

سراجؔ نے شاعری ترک کر دی اور دریائے تصوف میں غرق ہو کر باقاعدہ صوفی بن گئے۔ 1730ء میں جب سراجؔ کا دیوان مرتب ہوا اس وقت ان کی عمر ستائیس یا اٹھائیس سال تھی اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سراجؔ کا ضخیم کلیات جس میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے، ترجیع بند، مخمسات اور رباعیاں شامل ہیں صرف سات آٹھ سال کا نتیجۂ فکر ہیں۔

سید یحییٰ نشیط سراج کے کچھ خطوط کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ان خطوط کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ غلبہ شوق کے عارضے سے نکلنے اور سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی کی ادارت قبول کر لینے کے بعد سراج نے تجرد کی زندگی بسر کرنا پسند کر لیا تھا۔ چونکہ عزلت گزینی پسند تھی اس لیے تزوج کے دام میں پھنسنا انھوں نے قبول نہیں کیا اور ساری زندگی اپنے تکیہ میں تنہا گزار دی۔''

(سید یحییٰ نشیط، سراج اورنگ آبادی، مونوگراف، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی، 2016، ص:11)

سراج آخری وقت میں بہت علیل ہو گئے تھے۔ انھیں بواسیر، اسہال اور ضعف معدہ جیسے امراض لاحق ہو گئے تھے آخر انھیں امراض میں 4 رشوال 1177ھ بروز جمعہ (1763ء) اس دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ وفات کے وقت ان کی بزرگی کا ڈنکا ہر طرف بج رہا تھا خاصی تعداد میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ ان کی وفات پر سارے شہر میں سوگ منایا گیا۔ ان کے شاگردوں نے اورنگ آباد میں ہی ان کا مقبرہ بنا دیا جو آج بھی موجود ہے۔

شاہ عبدالرسول خاں کے مرتب کردہ کلیات کو بنیاد بنا کر عبدالقادر سروری نے جو کلیات مرتب کیا ہے اس کا کل سرمایہ غزلیات کے تین ہزار چھ سو اشعار، مثنویوں کے ایک ہزار پانچ سو چار، فردیات، قصیدہ، مستزاد، بازگشت اور مناجات کے ایک سو اٹھائیس اشعار، نور باعیات، پچاس مخمسات اور چار ترجیع بندوں پر مشتمل ہے۔ کلیات کی یہ ضخامت وہ بھی اتنی قلیل مدت میں سراج کے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہے۔

سراج کی مثنویوں میں بوستان خیال، سوز و گداز، نالہ ہجر، احوال فراق، خط بندگی اور مطلب دل شامل ہیں، ان میں ''بوستان خیال'' سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے جس میں گیارہ سو ساٹھ اشعار ہیں۔ سراج نے اسے صرف دو دن میں قلم بند کیا تھا یہ سوانحی مثنوی ہے، اس میں سراج نے اپنے حالات زندگی بیان کئے ہیں۔ خصوصاً واردات عشق کا بیان تفصیل سے پیش کیا ہے۔

سراج کو فارسی سے بہت رغبت تھی، اسی ذوق و شوق کے تحت انھوں نے فارسی شعرا کے بہت سے دیوان جمع کر لئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس 647 شعرا کے دواوین اکٹھا ہو گئے تھے۔ پھر انھیں میں سے اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب کر کے ایک ضخیم بیاض تیار کی جس کا تاریخی نام ''منتخب دیوانہا'' رکھا اس بیاض کے لیے انھوں نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا۔ مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تدوین انھوں نے حروف تہجی کے لحاظ سے کی اور اشعار کی ترتیب میں ردیف کا خیال رکھا، اس بیاض سے ان کا فارسی سے لگاؤ واضح ہوتا ہے۔ اس سے ان کے فارسی کلام کی قدر و قیمت کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس کا بہت کم حصہ محفوظ ہو سکا۔

سراج کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جیسے حمد، نعت، منقبت، مناجات اور خطوط وغیرہ مگر یہاں سب کی تفصیل ممکن نہیں۔

سراج کی شاعری میں عشق کا عنصر غالب ہے اور صوفی ہونے کے باوجود ان کا عشق مجازی ہے لیکن یہ وہ مجاز ہے جس کے ذریعے صوفیا حقیقت کے زینے طے کرتے ہیں۔ گو کہ سراج نے واردات عشق کے بصری پیکر تراشے ہیں لیکن ان میں نہ تو جنسی تلذذ کا رجحان ہے نہ سستی لذت پرستی کا ذکر۔ ان کا عشق بہت وسیع ہے یہ وہ عشق ہے جو بے خطر آتش نمرود میں کود کر حقیقت کا ادراک چاہتا ہے۔ جس کے بارے میں رومی نے کہا تھا کہ ''عقل ورق پہ ورق سیاہ کر دیتی ہے۔ لیکن عشق پورے آفاق کو منور کر دیتا ہے۔ وہ کاغذ اور روشنائی سے بے نیاز ہے اور براہ

راست گوشۂ دل کو منور کرتا ہے۔ عقل ماورائی جہات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔''

(سید نعیم الدین، مرید ہندی، آزاد کتاب گھر، دہلی، 1992، ص:55)

سراجؔ کا عشق بھی اسی طرح گوشۂ دل کو منور کرتا ہے۔

روشن ہے سبب عشق کے کیفیت عالم
آئینہ دل ساغر جمشید ہوا ہے

دوسرے بڑے شاعروں کی طرح سراجؔ بھی کمند عقل سے آزادی چاہتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عشق کے مراحل عقل سے نہیں جذبے سے طے ہوتے ہیں۔

اگر خواہش ہے تجھ کوں اے سراجؔ آزاد ہونے کی
کمند عقل کو اپنے گلے کا ہار مت کیجو

سراجؔ کے عشق میں ارضیت ہے اس میں سرور وانبساط اور جذب وکیف کے ساتھ جو تڑپ ہے۔ اس میں تسکین اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔

لب ورخسار کے گل قند سے لازم ہے علاج
دل کے آزار سیں بیمار ہوں، کن کا، ان کا

سراجؔ غم عشق کو شعوری طور پر اپنے اندر اتار لیتے ہیں اور پھر اس کی ساری کیفیات کا سرشاری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں یہ عمل شعر کے تاثر کو دوبالا کر دیتا ہے۔ ان کے غم عشق کے اظہار میں جو فطری والہانہ پن ہے وہ شاعر کی اندرونی کیفیت کو قاری کے دلوں میں اتار دیتا ہے۔

اے جان سراجؔ ایک غزل درد کی سن جا
مجموعہ احوال ہے دیوان ہمارا

تڑپنا، تلملانا، غم میں جلنا، خاک ہوجانا
یہی ہے افتخار اپنا یہی ہے اعتبار اپنا

سراجؔ نے خالص صوفیانہ شاعری بھی کی ہے جو سادگی اور وفور جذبات سے پر ہے۔ اس میں وہ بے ساختگی ہے جو خلوص سے پیدا ہوتی ہے۔

نظر کر دیکھ ہر شے مظہر نور الٰہی ہے
سراجؔ اب دیدۂ دل سیں صمد دیکھا صنم بھولا

عکس جمال دوست اسے آشکار ہے
درپن سیں دل کے زنگ کدورت کیا جو صاف

سراجؔ کے یہاں کہیں کہیں صنعت ایہام کا استعمال ہوا ہے مگر اس طرح نہیں کہ جو اردو شاعری پر ایک بدنما داغ بن گیا تھا بلکہ وہ بڑے نفیس انداز سے نازک خیالات کو لفظ ومعنی میں پرو دیتے ہیں۔ ان کے ایہام میں کہیں

ابہام نہیں آنے پایا ہے۔ان کی سادہ گوئی تفہیم وترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں ہونے دیتی۔

میرے بغل میں خواہش دنیا کا بت نہیں
کچلا ہوں میں نے لات سے سراس منات کا

آیا پیا شراب کا پیالہ پیا ہوا
دل کے دیئے کی جوت سے کاجل دیا ہوا

ناقدین نے دکن میں ولی کے بعد سراج کی شاعری کو صناعی کا بہترین نمونہ قرار دیا ہے۔سراج فصاحت سے زیادہ بلاغت پر زور دیتے ہیں یعنی وہ معنوی خوبیوں اور بے ساختہ پن کے قائل ہیں اور سادگی کا یہ عالم ہے کہ معنوی تہہ داری بھی شعر میں ثقالت اور پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دیتی۔تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا استعمال ان کے یہاں بہت فطری انداز میں ہوا ہے۔

تجھ کو اے آہو نگہ کس نے سکھایا یہ طرح
یا تو تھا اوروں سیں رم یا ہم سے رم ہونے لگا

سراج صنعتوں کو اس خاص اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ شعر سہل ممتنع کی مثال بن جاتا ہے۔صنعت تضاد کا یہ شعر دیکھیں:

وصل کے دن شب ہجراں کی حقیقت مت پوچھ
بھول جانی ہے مجھے صبح کو پھر شام کی بات

سراج نے لف ونشر کی چاروں قسموں کا بہت بے ساختہ استعمال کیا ہے یہاں لف ونشر مرتب کی صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

یار نے ابرو و مژگا سے مجھے صید کیا
صاحب تیر و کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

رعایت لفظی کی مثال دیکھیں:

سودائی بازار محبت جو ہوا ہے
زنہار خیال اس کو نہیں سود و زیاں کا

کہاں تک مثالیں دی جائیں اس ضمن میں اتنا بس ہے کہ سراج کو صنعتوں کے استعمال میں ملکہ حاصل تھا۔وہ صنعت لفظی ومعنوی کو برتنے کا ہنر جانتے تھے۔

سادگی، پرکاری اور بے ساختگی گو کہ سراج کا طرۂ امتیاز ہے پھر بھی کہیں کہیں انھوں نے مشکل زمینوں میں بھی شعر کہے ہیں۔یعنی اس پر بھی انھیں قدرت حاصل تھی۔ایک شعر مثال کے لیے:

ہے کہاں چہرۂ زری والا چشم بلبل کی بکتری والا

سراج کے یہاں محاورے اور ضرب الامثال کا بھی بہت برجستہ استعمال ہوا ہے۔

کیا ہوا گرچہ یار ہے نزدیک
آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے

عشق دونوں طرف سے ہوتا ہے کیوں بجے ایک ہاتھ سوں تالی

سراجؔ کے یہاں ایسی تراکیب اور بندشوں کا ذخیرہ ہے جو اظہار کے وسیلوں کو آسان اور پراثر بنا دیتا ہے جیسے لذت نعمت دیدار، کمند حلقہ گیسو، خیال عارض گل رنگ، خندۂ دنداں نما، مہ طناز، زلف گرہ دار، دام الفت، شکوۂ طرز تغافل۔ یہ ایسی تراکیب ہیں جنھوں نے سراجؔ کے کلام میں موسیقیت کو عروج بخشا ہے۔

سراجؔ کی شاعری زبان پر ماہرانہ اور خلاقانہ استعمال کی مظہر ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی، ہندی اور مراٹھی سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ اور زبان پر خاص توجہ دی ہے۔ ان کے یہاں ہندی الفاظ کا بہت استعمال ہوا ہے، کہیں کہیں تو وہ فارسی اور ہندی الفاظ کو ملا کر تراکیب بناتے ہیں، جیسے نقش چرن، طوالت کے خوف سے یہاں صرف دو شعر مثال کے لیے دیئے جا رہے ہیں۔

عشق کی جو لگن نہیں دیکھا وہ برہ کی اگن نہیں دیکھا
ٹک زمیں پر قدم رکھیو ساجن آج نقش چرن نہیں دیکھا

سراجؔ نے سادھو سنتوں کی سادھنا کی بہت سی اصطلاحات استعمال کی ہیں جیسے سمرن، مالا، بیراگی، راکھ، بھبھوت، برہ، پیا، پریتم وغیرہ۔

سراجؔ کو مراٹھی زبان سے بچپن سے ہی واسطہ رہا۔ ان کے یہاں مراٹھی الفاظ اردو لفظیات کے ساتھ شیر و شکر ہو کر ایک نیا لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ پن (مگر)، دستا (دکھائی دیتا)، پور اور اندھار کا انھوں نے بے ساختہ استعمال کیا ہے۔

زنجیر بھلی قید بھلی موت بھی جیوں تیوں
پن حق نہ کرے کسی کوں گرفتار کسی کا

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سراجؔ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے، وقت گزر جانے اور حالات بدل جانے کے باوجود جن کی مقبولیت اور اہمیت کم نہیں ہوتی اور وہ ہمیشہ دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ عظیم شاعر اور عظیم شاعری کی یہی شناخت ہے۔

5.3.3 متن کی تدریس

I غزل

اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے گا
ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا
جس بیت میں تعریف لکھوں اس کی بھنوؤں کی
البتہ ہلالی بھی اسے صاد کرے گا

مغرور نہ ہو صافیٔ رخسار پہ اپنے
پھر نئیں تو مری بات کو تو یاد کرے گا
البتہ سر آنکھوں سے کروں گا اسے منظور
جو عشق کا ہادی مجھے ارشاد کرے گا
معلوم ہوا عشق کے اطوار سے یوں کر
مجھ عقل کی بنیاد کوں برباد کرے گا
جلتا ہے سراجؔ آتش ہجراں میں صنم کی
کس دن دل غمگیں کوں مرے شاد کرے گا

اشعار کی تشریح:

اس پھول سے چہرے کو جو کوئی یاد کرے گا
ہر آن میں سو سو چمن ایجاد کرے گا

عشق سراجؔ کی شاعری کا محور ہے اور محبوب اس کا مرکزی نکتہ وہ عشق کی کیفیات کو سو سو طرح سے بیان کرتے چلے جاتے ہیں پھر بھی محسوس کرتے ہیں کہ بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔ لہٰذا نئے نئے زاویئے پیدا کرتے ہیں۔ رُخِ محبوب کو پھول کہنا یا پھول سے تشبیہ دینا بڑا پامال موضوع ہے۔ سراجؔ نے اسے پھول کہا تو ہے لیکن اس میں ایک نیا زاویہ پیدا کر دیا ہے کہ وہ پھول تو ہے مگر ایسا کوئی عام سا پھول نہیں بلکہ پھولوں کا چمن زار ہے۔ اسے دیکھنا تو دور اسے یاد کرتے ہی ہر آن نظروں میں سو سو چمن کھل جاتے ہیں محبوب کی تعریف کا یہ نرالا انداز ہے۔

جس بیت میں تعریف لکھوں اس کی بھنوؤں کی
البتہ ہلالی بھی اسے صاد کرے گا

یہاں شاعر کا مقصد محبوب کی بھنوؤں کی تعریف کرنا ہے، لہٰذا وہ کہتا ہے کہ محبوب کی بھویں اتنی خوبصورت ہیں کہ اگر کسی شعر میں اس کی تعریف لکھوں تو ماہ نو بھی اسے تسلیم کرے گا جبکہ ماہ نو خود بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ محبوب کی بھنوؤں کو براہ راست ماہ نو سے تشبیہ دینے کے بجائے ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے یہی سراجؔ کی انفرادیت ہے۔

مغرور نہ ہو صافیٔ رخسار پہ اپنے
پھر نئیں تو مری بات کو تو یاد کرے گا

یہاں شاعر محبوب سے کہہ رہا ہے کہ اپنے ہموار، چکنے اور بے داغ رخسار پر غرور مت کر۔ (ورنہ جب شباب کا عالم ختم ہو جائے گا) نہیں تو ایک نہ ایک دن تو میری بات کو ضرور یاد کرے گا۔ اس شعر میں محبوب کے رخساروں کی تعریف کی گئی ہے اور غرور سے پرہیز کرنے کی صلاح بھی دی گئی ہے جو ایک اخلاقی نکتہ ہے۔ بنیادی مقصد یہاں بھی محبوب کے صاف شفاف رخساروں کی تعریف کرنا ہے۔

البتہ سر آنکھوں سے کروں گا اسے منظور
جو عشق کا ہادی مجھے ارشاد کرے گا

سراجؔ کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ بات کو گھما پھرا کر پیچیدہ بنا کر نہیں پیش کرتے سیدھے سادے انداز میں بیان کرتے ہیں جس سے براہ راست ترسیل کے راستے کھلتے ہیں۔اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ عشق کا راستہ دکھانے والا جس طرف رہنمائی کرے گا جس راستے پر چلنے کو کہے گا اسے دل کی گہرائیوں سے قبول کروں گا۔سر آنکھوں سے قبول کرنے کا مطلب اسے صدق دل سے قبول کروں گا۔عشق کا ہادی سے مراد محبوب بھی ہو سکتا ہے مگر یہاں غالب رجحان پیر و مرشد کی طرف ہے۔

معلوم ہوا عشق کے اطوار سے یوں کر
مجھ عقل کی بنیاد کوں برباد کرے گا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے عشق سے راہ و رسم بڑھانے کے بعد اس کے طور طریقوں سے یہ معلوم ہوا کہ راہ عشق پر چلنے کے لیے عقل راہ نما نہیں ہو سکتی یہاں تو جذبہ بے اختیار سے کام بنتا ہے۔عقل کوں برباد کرے گا مطلب ہے کہ جب عشق اختیار کیا تو اس میں عقل تو کچھ کام نہیں آئے گی گویا وہ برباد ہی ہوگی اور اس کی بربادی کا سبب عشق ہوگا۔عقل تو لب بام محو تماشائی ہے مگر جذبۂ عشق ایک جست میں قصہ تمام کر دے گا۔

جلتا ہے سراجؔ آتش ہجراں میں صنم کی
کس دن دل غمگیں کوں مرے شاد کرے گا

سراجؔ کے یہاں عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو۔اس شعر میں بھی وہ ہجر کی کیفیت کا اظہار کر رہے ہیں اور یہ اظہار محبوب سے براہ راست ہے اور بہت سیدے سادھے الفاظ میں ہے کہ میں عشق میں ہجر کی کلفتوں کو جھیل رہا ہوں آخر تو میرے دل کو کب شاد کرے گا مجھے اس غم سے کب نجات دلائے گا یعنی تیرا وصل آخر کب نصیب ہوگا کہ یہ میرا دل شاد ہو جائے۔

II غزل

ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا — نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا
دوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن — کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا
خم گیسو سیں اپنے گرہ کھول — کھلے تا عقدۂ مشکل کسی کا
حنا سیں تم نے نہیں باندھے ہو موٹھی — لیے ہو، ہات، شاید دل کسی کا
گلی میں جس کے شور کربلا ہے — سلونا شوخ ہے قاتل کسی کا
سراجؔ اب سوز دل میرا وو جانے — جو ہے پروانۂ محفل کسی کا

اشعار کی تشریح:

ہوا ہوں ان دنوں مائل کسی کا
نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

چھوٹی بحر کی غزل ہو یا طویل بحر کی سراجؔ کا سہل ممتنع ہر جگہ قائم رہتا ہے۔یہ چھوٹی بحر کی غزل ہے مگر اس میں سہل ممتنع کا استعمال قابل دید ہے۔اس شعر میں وہ اپنے دل کی کیفیت بیان کر رہے ہیں کہ ان دنوں مجھے کسی

سے عشق ہو گیا ہے۔ نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا، اس میں عشق کی شدت کا دبا دبا اظہار ہے کہ اس سے پہلے مجھے اس غم کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

دوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن
کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا

اس شعر میں سراجؔ نے ایک انوکھا انداز اختیار کیا ہے کہ وہ دل کو غیر تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس دل کو جو عشق میں دیوانہ ہو گیا ہے، لاکھ سمجھاتا ہوں کہ عشق میں بہت پریشانیاں ہوتی ہیں بہت مصیبتیں جھیلتی پڑتی ہیں اس سے باز آجا لیکن وہ مانتا نہیں پھر عاجز آکر کہتے ہیں کہ آخر دوسروں کے معاملات میں کوئی کہاں تک حائل ہو۔ کہاں لگ ہوئے کوئی حائل کسی کا۔ ''کسی کا'' سے دل کی غیریت قائم ہوتی ہے۔

خم گیسو سیں اپنے گرہ کھول
کھلے تا عقدۂ مشکل کسی کا

اس میں شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تو نے اپنے گیسو میں خم ڈال کر جو گرہ باندھ رکھی ہے یعنی دل میں کدورت رکھی ہے۔ ''گرہ کھولنا'' کا مطلب کدورت دور کرنا بھی ہوتا ہے۔ اپنے دل سے کدورت دور کر، تو میرے اوپر جو مشکل پڑی ہوئی ہے اس کا بھید کھلے یعنی تو مجھ سے گریزاں کیوں ہے اس کا راز کھلے اور میری مشکل آسان ہو جائے۔

حنا سیں تم نے نہیں باندھے ہو موٹھی
لیے ہو، ہات، شاید دل کسی کا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ یہ تم نے مہندی لگے ہوئے ہاتھ کی مٹھی نہیں باندھ رکھی ہے بلکہ شاید ہاتھ میں کسی کا، کسی عاشق کا، دل لے رکھا ہے یہ ہاتھ کا حنائی رنگ نہیں بلکہ دل پر خوں کا عکس ہے۔

گلی میں جس کے شور کربلا ہے
سلونا شوخ ہے قاتل کسی کا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ یہ جس کی گلی میں کربلا کا سا شور ہے جس میں عاشقاں ایک کے بعد ایک قتل ہو رہے ہیں۔ ان کا قاتل کوئی اور نہیں بلکہ اپنا خوبصورت شوخ محبوب ہی تو ہے جس کے حسن پر لوگ پروانوں کی طرح نثار ہو رہے ہیں۔ یہ بھی محبوب کے حسن کی تعریف کا ایک انداز ہے۔

سراجؔ اب سوز دل میرا وہ جانے
جو ہے پروانۂ محفل کسی کا

سراجؔ اس شعر میں محبوب کی بے وفائی کا شکوہ کر رہے ہیں کہ میرے دل کی سوزش اور تکلیف کا ذمہ دار تو وہی ہے جو اب کسی اور کی محفل کا پروانہ ہو گیا ہے۔ یعنی اب جس کی نظر عنایت کسی اور پر ہے۔ وہ جانے سے یہ بھی مراد ہے کہ وہی چاہے تو اس کا کچھ علاج ہو سکتا ہے ہم نے تو اسی پر چھوڑ دیا ہے۔

5.4 آپ نے کیا سیکھا۔

اس اکائی میں آپ نے

- سیکھا کہ کن وجوہات کی بنا پر اردو ادب کا ارتقا پہلے دکن میں ہوا جبکہ اردو زبان کی ابتدا شمالی ہند میں ہوئی۔
- ولؔی کی شاعری کی خصوصیات سے جانکاری حاصل کی۔
- ولؔی کی دو غزلوں کا تجزیہ کیا۔
- سراؔج کی شاعری کی خصوصیات سے متعارف ہوئے۔
- سراؔج کے کچھ اشعار کو سمجھنے کی کوشش کی۔

5.5 اپنا امتحان خود لیجئے۔

1- اردو زبان کے شمال سے دکن پہنچنے کے اسباب کیا تھے؟

2- سراج کہاں پیدا ہوئے اور ان کا مقبرہ کہاں ہے؟

3- سراج کی شاعری کے امتیازات کیا ہیں؟

4- سراج نے کس طرح کی زندگی گزاری؟

5- ولؔی اور سراؔج اورنگ آبادی کی غزلوں سے ایک ایک شعر کی تشریح کیجیے؟

I ولؔی: نہ چھوڑے محبت دم مرگ تک جسے یار جانی سے یاری لگے

II سراؔج: ہوا ہوں ان دنوں مائل کس کا نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

5.6 سوالوں کے جوابات

1- علاؤالدین خلجی کا دکن کو فتح کر کے سو سو مواضعات کا انتظامی حلقہ بنا کر ہر حلقے پر شمال سے تعلق رکھنے والا اپنا ایک افسر (اصحاب صدہ) مقرر کرنا۔ محمد تغلق کا دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کرنا۔ صوفیا کی دکن کی طرف مراجعت۔

2- سراؔج اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور ان کا مقبرہ بھی وہیں ہے۔

3- سراؔج کی شاعری میں وہ عشق مجازی ہے جو عشق حقیقی کا پہلا زینہ ہوتا ہے۔ وہ ولی کا تتبع کرتے ہیں۔ سادگی، سلاست، روانی اور موسیقیت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ ہندی الفاظ کا بہت برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

4- سراؔج نے ایک صوفی کی مجرد زندگی گزاری۔

5- ولی اور سراج اورنگ آبادی کی غزلوں سے ایک ایک شعر کی تشریح

I ولی: نہ چھوڑے محبت دم مرگ لگ جسے یار جانی سوں یاری لگے

اس شعر میں ولی دکنی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یارِ جانی یعنی جان کی طرح عزیز محبوب سے اگر یاری یعنی محبت ہو جائے تو وہ پھر زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوتی ہے۔ اس میں وہ محبوب کی تعریف و توصیف بیان کر رہے ہیں کہ محبوب اتنا دل فریب اور خوش ادا ہے کہ ایک بار اس سے محبت ہو جائے تو پھر اس سے روگردانی ممکن نہیں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عشق ایسا روگ ہے کہ ایک بار لگ گیا تو پھر موت کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

II سراج: ہوا ہوں ان دنوں مائل کس کا نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا

اس شعر میں سراج اورنگ آبادی اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان دنوں مجھے کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ نہ تھا میں اس قدر گھائل کسی کا، اس میں عشق کی شدت کا دبا دبا اظہار ہے کہ اس سے پہلے مجھے اس غم کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔

5.7 فرہنگ

لفظ	معنی
شمال	اتر
جنوب	دکھن
ثقافتی	تہذیبی
پایہ تخت	راج دھانی۔ دارالحکومت
ہجرت	وطن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنا
برگ و بار	پتے اور پھل
سخن	بات۔ شاعری
ارباب نشاط	ناچنے گانے والے
متوازن	توازن والا
قرائن	قرینہ کی جمع، سیاق
متعلقات	متعلق کی جمع۔ تعلق رکھنے والا۔ لگاؤ رکھنے والا
برائے	واسطے
گفتن	کہنا
جمالیاتی	حسن شناسی
انبساط	خوشی
لبریز	بھرا ہوا
شب خلوت	رات کی تنہائی
وابستہ	متعلق
منفرد	ایک۔ تنہا

متواضع	خاطر کرنے والا۔تواضع کرنے والا
سروری	سرداری۔افسری
قلندری	دین ودنیا سے آزاد آدمی
جام جمشید	جمشید کا پیالہ
رازہائے سربستہ	چھپا ہوا راز
شیروشکر	آپس میں ملا ہوا
ترکش	تیر رکھنے کا خول
بان	تیر
شتاب	جلدی
ریختہ	ملی ہوئی زبان۔اردو جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔
نرم سیر	آہستہ رو
ماہیئت	حقیقت۔اصلیت
سرفرازی	فخر سے سر اٹھا کر چلنا
نواح	قریب۔آس پاس
ملحق	ملا ہوا
متداولہ	رائجؔ
افاقہ	مرض میں کمی۔شفا
تبحر علمی	نہایت علمی وسعت
زنگ	مورچہ
آہو	ہرن
رم	بھاگنا
ہادی	رہبر۔راستہ دکھانے والا

5.8 کتب برائے مطالعہ

1- تاریخ ادب اردو، جلد اول	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2013
2- ولی گجراتی	سید ظہیر الدین مدنی	ادبی پبلشر، 8 شیفرڈ روڈ، بمبئی، 1974
3- ولی فن وشخصیت اور کلام	ساحل احمد	اردو رائٹرس گلڈ، الٰہ آباد، 1979
4- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1983
5- سراج اورنگ آبادی (مونوگراف)	سید یحییٰ نشیط	این سی پی یو ایل، نئی دہلی، 2016